زبانوں کی تہذیبی اہمیت
عربی زبان و قرآن حکیم؛ اہمیت و کردار

محمد عمران*

ABSTRACT

Languages are considered God-gifted and human being is far superior in linguistic skills as compared to other creartures. Language is associated with the civiliztion and demise of a language leads to death of that civilization. The words and phrases of a language are the outcome of spicfic epistemologisal environment of a civilization and cannot be used in the same mining in any other languge.

Arabic, the language of Quran, has unique charastaristics whiche no other language has. Simiraly, the Quran is superior than all other revealed books in all respects. A critical analyses and evaluation reveles that Quran is the word of Allah as claimed by it, by the Prophet (SAW) and by the Muslims; and its accuracy, authenticity and sanctity is acknowledged by its friends and foes and no other revealed book can compet it in this regard.

Keywords: تہذیب، عہد نامہ عتیق، زبان، فطرت، لسانیات، استعماری طاقتیں

* دانشور، ایم فل علوم اسلامیہ، کراچی

منہ میں گوشت کا سرخ ٹکڑا یا عضو، زبان، جیبھ، لسان یا Tongue کہلاتا ہے۔ جس میں قوتِ ذائقہ ہوتی ہے اور جب انسان اس کے ذریعہ کلام کرتا ہے، بولتا ہے تو اسے بولی (Language) کہا جاتا ہے۔ دورِ جدید میں زبان کے بارے میں علم کو لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔ زبان آوازوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں صوت، حرف پر مقدم ہوتی ہے یعنی پہلے آواز پیدا ہوتی ہے پھر ان صوتیات سے الفاظ جنم لیتے ہیں۔

زبان، احساسات و خیالات کے اظہار کا ایک قدرتی سرچشمہ ہے۔ ہماری زبان کی انفرادیت یہ نہیں کہ ہم باہم بات چیت کرسکتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ صلاحیتِ نطق انسان کو دیگر مخلوقات خصوصاً حیوانات کے مقابلے میں زیادہ وسعت و تنوع عطا کرتی ہے۔[1] قرآن عظیم کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولی بھی سکھائی گئی تھی اور وہ حشرات الارض کی زبان بھی بخوبی سمجھتے تھے۔[2] گویا تمام مخلوقات کو قدرتِ نطق عطا کی گئی ہے مگر انسانی قوتِ گویائی نہ صرف افضل و اعلیٰ ہے بلکہ اس کے ذریعے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے اور اپنی سوچ، افکار اور نظریات تحریری زبان میں محفوظ بھی کرلیتا ہے۔

زبان کی ابتداء

زبان کی ابتداء کے حوالہ سے بنیادی طور پر دو نقطہ نظر موجود ہیں:

۱۔ روایتی یا مذہبی نقطہ نظر ۲۔ جدید یا غیر مذہبی نقطہ نظر

۱۔ مذہبی نقطہ نظر

کتب سماویہ و مذہبیہ مثلاً کتابِ مقدس (عہد نامہ عتیق) اور قرآنِ حکیم میں زبان کو ایک وہبی یا عطائی صلاحیت کہا گیا ہے۔

(۱)۔ عہد نامہ عتیق میں ہے:

" اور خداوند خدا نے کل دشتی جانور اور ہوا کے کل پرندے مٹی سے بنائے اور ان کو آدم کے پاس لایا کہ دیکھے کہ ان کے کیا نام رکھتا ہے اور آدم نے جس جانور کو جو کہا وہی اس کا نام ٹھہرا۔"[3]

---

(۱) "ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے (ملائکہ، جمادات و نباتات و حیوانات) اس کی تسبیح (تعریف) کررہے ہیں۔ ایسی کوئی شے نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم اس کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے (بنی اسرائیل:۴۴) نیز (الرعد:۱۳، الانبیاء:۷۹)۔

(۲) النمل:۱۶۔۱۹

(۳) کتاب پیدائش (۲: ۲۰-۱۸)۔

(۲)۔ قرآنِ مہیمن میں ارشادِ ربانی ہے: " اور اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا، اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) سے فرمایا: تم ان کو ان کے نام بتادو۔ جب انھوں نے بتادیے۔ "[۱] یہاں دو باتیں نوٹ کرنے کے قابل ہیں:

زبان و بیان کی صلاحیت عطائے ایزدی یا وہبی شے ہے۔

عہدِ عتیق میں ہے: آدم (علیہ السلام) نے جس جانور کو جو کہا وہی اسکا نام ٹھہرا"۔ جبکہ قرآنِ مہیمن واضح کرتا ہے کہ اللہ علیم و حکیم نے آدم (علیہ السلام) کو اشیاء کے نام سکھائے (علم الاسماء) پھر انھوں نے فرشتوں کے سامنے ان اشیاء کے نام بتائے۔ بائبل میں مادی کائنات کے علم کو براہِ راست 'بشر۔ انسان' سے جوڑا گیا ہے جس سے اکتسابی علوم میں فلسفہ انسانیت (Humanism) کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآنِ حکیم میں مادی علوم و فنون کی راست نسبت بھی خالقِ آدم سے کی گئی جس سے "الہٰیت (Tauheedism) "کی وسطیت نمایاں ہوتی ہے جو الہامی مذاہب کا طرہ امتیاز ہے۔

(۱) البقرہ: ۳۱۔۳۳

زبان کے عطائی ہونے کی تائیدی شہادتیں

زبانیں اور حروفِ تہجی

دنیا کی اہم زبانوں کے حروفِ تہجی میں باہم گوناگوں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کا براہِ راست مذہبی حوالہ ہمیں عہدِ نامہ عتیق کی کتاب پیدائش میں ملتا ہے۔[۱] اکثر زبانوں میں کچھ الفاظ کی ادائی میں حیرت انگیز مشابہت بآسانی دیکھی جاسکتی ہے خصوصاً ماں باپ، جنت، قیامت اور پانی کے الفاظ ہیں۔ مثال کے طور پر ماں کو عربی میں (اُم)، انگریزی میں (mother)، سنسکرت میں (مادر)، برمی میں (امی) اور ملیالم میں (ماں) کہتے ہیں۔ اسی طرح زبانوں کے حروفِ تہجی میں بھی کسی قدر مشترکات موجود ہیں۔ جیسے الف کو عربی، عبرانی اور حبشی زبان میں الف، یونانی 'الفا' اور انگریزی 'a' کہتے ہیں۔[۲]

زبان اور فطرت

انسان کی تبدیل نہ ہونے والی فطرت کے بارے میں قرآنِ پاک واضح بیانیہ پیش کرتا ہے۔[۳] متحقق ہے کہ زبانیں پہلے وجود میں آتی ہیں اور پھر ان کے قواعد وضوابط مرتب کیے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ صرف چند ہی زبانوں کے صرف ونحو[۴] مرتب کیے گئے ہیں جبکہ مصنوعی زبانیں جن کی گرامر پہلے مرتب کر کے انہیں رائج کرنے کی سعی لاحاصل کی گئی اور جن کی تعداد کم وبیش سینتیس (۳۷) ہے۔ ان کے ناکام ہونے کی وجہ یہی تھی کہ بولی ایک ایسی صلاحیت ہے جو اندر سے پھوٹتی ہے اسے باہر سے لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ چند مصنوعی زبانیں یہ ہیں: پولش فزیشن Zemenholf Ludwik (۱۸۵۸ء-۱۹۱۷ء) سے منسوب Planeta، Speranto (۲۰۱۰ء)، Europanto (۱۹۹۶ء) اور Solresol (۱۸۲۷ء)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل کی اصلاح و تہذیب کے لئے مبعوث کیے گئے لہذا آپ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں نے یہودی شرع کو اختیار کیے رکھا اور اس پر عمل کا حکم دیا۔ بائبل (عہدنامہ جدید) مسیحی قول نقل کرتی ہے:

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی تعلیم کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا

---

(۱) طوفانِ نوح تک تمام انسانوں کی ایک ہی بولی تھی۔ پھر خدا نے انہیں منتشر کر دیا اور زبان میں اختلاف پیدا ہوا۔ (کتابِ پیدائش ۱۱: ۱تا۹)۔

(۲) مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ماہنامہ ساحل، کراچی، جنوری، فروری، اگست ۲۰۰۵۔

(۳) فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (الروم: ۳۰)۔

(۴) Morphology

ہوں۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سے سے چھوٹا کہلائے گا لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور ان کی تعلیم دے گا وہ آسمانی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا۔"[1]

لیکن بعد از رفعِ عیسیٰ (علیہ السلام)، سینٹ پال(۴-۶۴ء) نے اور پھر قریباً ۳۰۰ برس بعد مختلف عیسائی کونسلوں خصوصاً نیقیہ کونسل(۳۲۵ء) و دیگر نے عیسائی عقائد، تعلیمات و اصطلاحات وضع کیں۔

نیز یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ چرچ نے بائبل میں جن کتابوں کا انتخاب کیا اس میں معیار یہ نہ تھا کہ کون سی تحریر یا روایت صحیح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچتی ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا تھا کہ کونسی کتاب کلیسا کے پسندیدہ مروجہ نظریات کی تائید کرتی ہے۔ عقیدہ تثلیث، تجسیم عیسیٰ (علیہ السلام)، ابنیت(Son Ship)اور کفارہ وغیرہ جیسے عقائد اسرائیلی مذہب میں موجود نہ تھے۔ گویا موجودہ مسیحیت فطری والہامی نہیں بلکہ مصنوعی و انسانی سرگرمیوں اور کارگزاریوں کا حاصل ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ»[2]

"ہر بچہ فطرت(اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔"

اسلام دینِ فطرت ہے اس کے عقائد و اعمال کی بنیادیں قرآن و سنت نے استوار کردیں بعد ازاں علمائے اسلام نے دین کی مبادیات ولوازمات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے اصطلاحاتِ دینیہ اور علوم اسلامیہ وضع کیے۔ مثلاً فقہی شرعی احکام واصول (تکلیفی اور وضعی) میں ایجاب (واجب و فرض)۔ ندب (مستحب و مندوب)، حرمت (حرام و ممنوع) کراہت (مکروہ تحریمی و تنزیہی)۔ اباحت (مباح وغیرہ)۔ اسلامی روایت میں مفسر، متکلم، محدث، مفتی وغیرہ دینی علوم کے ماہرین ہیں نہ کہ ان کے واضع اور شارع۔

تاریخی شہادت

پانچویں صدی قبل مسیح کے یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے مطابق قدیم مصری بادشاہ فرعون (۶۱۰-۶۶۴ق م) نے اور بعد ازاں رومن شاہ فریڈرک دوم (۱۱۹۴ء-۱۲۵۰ء) اور سکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمز چہارم

---

(۱) انجیل متی(۵: ۱۷، ۱۹)۔

(۲) البخاری، محمد بن اسماعیل ،صحیح بخاري،كِتَابُ الجَنَائِزِ ،بَابُ إِذَا أَسْلَمَ الصَّبِيُّ فَمَاتَ، هَلْ يُصَلَّى عَلَيْهِ، وَهَلْ يُعْرَضُ عَلَى الصَّبِيِّ الإِسْلاَمُ (رقم:۱۳۵۸)۔

(۱۴۸۸ء۔۱۵۱۳ء) نے نوزائیدہ بچوں کو تنہائی اور جنگل میں رکھ کر ان کی زبان سننے کی کوشش کی مگر جنگل میں پرندوں اور مختلف جانوروں کی بولیاں سننے کے باوجود وہ گونگے ہی رہے۔ یہ بچے ان آوازوں کے ملاپ یا اشتراک سے کسی قسم کے الفاظ بولنے پر قادر نہ ہو سکے۔ گویا اللہ تعالیٰ اگر انسان کو بے زبان پیدا کرتا تو وہ آج بھی بولنے کی عظیم نعمت سے محروم ہی ہوتا۔

بہت سے ماہرین لسانیات کی رائے ہے کہ ساری انسانی زبانیں کسی ایک ہی بنیادی زبان کی شاخیں ہیں۔ (۱)

محقق کارل وی لینڈ کی رائے یہ ہے کہ:

"مختلف زبانوں پر تحقیق سے یہی بات آشکارا ہوتی ہے کہ بابل میں جو چند زبانیں ابتداءً تخلیق ہوئی تھیں انہی سے وہ بے شمار زبانیں پھوٹی ہیں جو آج کل انسانی معاشروں میں مروج ہیں۔" (۲)

۲۔ جدید نقطۂ نظر: توقیفی یا اکتسابی

افلاطون (347-427ق م) کا 'توقیفی نظریہ' زبان کے عطائی ہونے کی عقلی تائید کرتا ہے اس کے بقول لغت، عطیہ الٰہیٰ ہے۔ اس کے برعکس اس کے شاگرد ارسطو (۳۲۲-۳۸۴ق م) کا 'اصطلاحی نظریہ' زبان کو سماجی مظہر یا اکتسابی کہتا ہے۔ دورِ تنویر (Enlightenment) (۱۶۸۵ء-۱۸۱۵ء) کے فرانسیسی فلسفی روسو (۱۷۱۲ء ۔۱۷۷۸ء) اور جرمن جان ہرڈر (۱۷۴۴ء-۱۸۰۳ء) ارسطو کے نظریہ کے زبردست حامی و موید رہے ہیں۔ مغرب میں بعد ازاں عطائی یا اکتسابی کی بحث چھوڑ کر تاریخی و تقابلی لسانیات کا آغاز ہوا۔ لسانیات میں جدید تحقیق کے بانی سوئس فرڈینڈ دی سوسیر (۱۸۵۷ء-۱۹۱۳ء) نے اپنی کتاب Sourse of Linguistique Generole لکھی۔ جس میں اس نے توضیحی لسانیات (Descriptive Structural Approach) کو آگے بڑھایا جس کا آغاز ہندی مفکر پانینی (چوتھی صدی قبلِ مسیح) نے واضح مذہبی مقاصد کے تحت کیا تھا اور بعد میں عرب ماہر لسانیات سیبویہ (۷۶۰ء-۷۹۶ء) نے اسے تقویت بخشی۔ سوسیر نے واضح کیا کہ زبان کے اصول و قواعد میں مذہبی ادب کا بنیادی کردار رہا ہے۔ مثلاً رامائن و گیتا، کتابِ مقدس و تالمود، اوستا، الیڈ، اوڈیسی، اینائڈ، کامیڈی، فردوسِ گم گشتہ وغیرہ۔ بعد ازاں نوم چومسکی (۱۹۲۸ء) نے Syntactic Structure (۱۹۵۷ء) میں سوسیر کی تحقیق کو آگے بڑھایا اور 'قواعدِ تحویلیہ' (Transformational Rules) کا تصور پیش کیا۔ دورِ حاضر کے علمِ لسانیات اس کے نظریہ ہی کی چھاپ ہے۔ اس نے کہا ہے کہ لغت وہ قدرت ہے جو معاشرہ کے ہر فرد میں

(1) https://www.trueorigin.org/language01.php The Origin of languages and communication by Dr.Grad Harrub.

(2) Wieland, C., Towering change, Creation 22(1): 22-26, 1999,(P.22).

پائی جاتی ہے۔اس کی بدولت وہ ایسے جملے تخلیق کرتا ہے جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنے ہوتے۔زبان کے اس ملکہ کو وہ معرفتِ لغوی کا نام دیتا ہے۔[۱]

گویا جدید نقطہ نظر بھی اس بات کی چار و ناچار تائید ہی کرتا نظر آتا ہے کہ زبان ایک عطائی یا وہبی صلاحیت ہے لیکن چونکہ مابعد الطبیعیاتی حقائق سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہیں لہذا جدید علمِ لسانیات نے اس سوال کو تشنہ تعبیر چھوڑ کر اس کے افادی پہلو اور تشکیلی لسانیات پر اپنی زیادہ تر توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔

زبانیں اور استعماری طاقتیں

گزشتہ تین سو سالہ نو آبادیاتی تاریخ بتاتی ہے کہ ولندیزی، انگریز، پرتگیزی، روسی، فرانسیسی، امریکی اور ہندو استعماری قوموں نے دنیا میں جہاں بھی اپنی نو آبادیات قائم کیں وہاں لوگوں کو غلام بنایا، اصل باشندوں کو وحشی قرار دے کر قتل کیا، ان کی زبانیں مٹادی گئیں یا ان کا رسم الخط تبدیل کر دیا گیا یا کم از کم اس کی کوشش ضرور کی گئی۔صرف مسلمان حکومتیں اس سے مستثنیٰ ہیں، مسلمان جہاں بھی گئے انھوں نے اپنے مقبوضات کی علمی و مروجہ زبانیں نہ صرف سیکھیں بلکہ ان کے فروغ و ابلاغ میں اپنا تعمیری و مثبت کردار بھی ادا کیا۔یونانی و ہندی علوم و فنون کی نشاۃ و ارتقاء میں مسلم کردار مسلمہ حقیقت ہے۔

مورخین کے مطابق ۸۰ لاکھ اور بعض کے نزدیک ۹ کروڑ مقامی امریکی باشندوں (سرخ ہندیوں) کا قتلِ عام کیا گیا اور ان کی نسل کشی کی گئی۔جب نسلیں ہی باقی نہ رہیں تو زبانیں بھی ختم ہو گئیں۔[۲] مقتول مارٹن لوتھر کنگ جونئیر (۱۹۶۸ء) سے قبل امریکی سیاہ فام آبادی غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ان کی عبادت گاہیں (چرچ)، مراکزِ صحت و صفائی، تعلیمی اور دیگر سماجی و معاشی ادارے سفید فام امریکیوں سے الگ و کمتر درجے کے رکھے جاتے تھے۔امریکہ میں دورِ غلامی (۱۵۰۱ء-۱۸۶۵ء) کے گزر جانے کے صدیوں بعد بھی چوالیسویں امریکی سیاہ فام صدر باراک اوباما (۲۰۰۹-۱۷) اصل امریکی باشندوں سے روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کا موقع بے موقع اظہار کرنے پر داخلی و خارجہ پالیسی سازوں کی تنقید و بے چینی کا شکار رہے۔

روسی استعماریت نے تمام مسلمان مقبوضات کے رسم الخط عربی سے سریلی (Cyrillic) میں تبدیل کر دیے مگر عیسائی مقبوضہ جات کے ساتھ فراخ دلانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ہندو مت کا احیاء ہوا تو طاقت کے بل پر بدھ مت کی پالی اور دیگر شمالی ہند کی زبانیں مٹانے اور سنسکرت کو زندہ کرنے کی کوشش ہوئی لیکن سنسکرت عوامی زبان

---

(۱) احسان الحق، ڈاکٹر، اردو عربی کے لسانی رشتے، قرطاس پبلشنگ، دسمبر ۲۰۰۵ء (ص:۱۹)۔

(2) Mann ,Michael,The Dark side of Democracy, Cambridge University Press, New York, 2005.

نہ بن سکی۔۱۸۰۸ء میں برہمن للولال جی نے بھگوت گیتا کا ترجمہ 'پریم ساگر' کرتے ہوئے عربی وفارسی کے الفاظ نکال کر ان کی جگہ برج بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ شامل کیے اور اسے فارسی رسم الخط کے بجائے دیوناگری خط میں لکھا۔

محقق F.E.K.Key لکھتا ہے:

"للو جی، ان کے ساتھی اور فورٹ ولیم کالج کے ذمہ داران کی وجہ سے ہندی زبان وجود میں آئی۔ 'ولیم کالج' کے قیام سے قبل ہندی زبان کا کوئی وجود نہ تھا اور نہ اس زبان میں کوئی تخلیقی کام ہوا تھا۔"[۱]

برصغیر میں فارسی زبان کی مذہبی و سماجی حیثیت واہمیت اور افادیت سے اہلِ علم بخوبی واقف ہیں مگر دورِ استعمارِ فرنگی میں فارسی زبان کو گورنر جنرل لارڈ بینٹنک (۱۷۷۴ء-۱۸۳۹ء) نے ۲۰/نومبر ۱۸۳۷ء کو منسوخ کر دیا اور فارسی کی بے وقعتی و کسمپرسی کا یہ حال ہو گیا کہ محاورہ مشہور ہوا 'پڑھو فارسی بیچو تیل' اور اب فارسی کا اس خطہ ارضی میں کیا مقام و مرتبہ رہ گیا ہے اس کے بیان کی حاجت نہیں۔

پاکستان اور اردو زبان

اردو تقریباً ۶۰۰ ملین لوگوں کی دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔ پاکستان کی قومی زبان اردو کو تمام ادارتی سسٹم سے بے دخل کر کے انگریزی زبان کو اس کی جگہ رائج کیا جاچکا ہے۔ بانی پاکستان حضرت قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے اجلاس میں کہا تھا:

"میں واضح الفاظ میں بتادینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اور صرف اردو ہوگی۔ ایک مشترکہ قومی زبان کے بغیر نہ تو کوئی قوم پوری طرح متحد رہ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کام کر سکتی ہے"۔

۸ ستمبر ۲۰۱۵ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان کے جسٹس جواد ایس خواجہ نے ۱۹۷۳ء کے آئینِ پاکستان کے آرٹیکل ۲۵۱ کے تحت اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کا حکم دیا۔ پہلی بار اردو میں حلف اٹھایا، آفس کے باہر اردو میں اپنے نام کی تختی آویزاں کی، مگر بڑے تالاب میں گری کنکری کی وقتی معمولی سطحی ارتعاش و جنبش کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ بوجوہ اس رائے کو پاکستان میں حکومتی، ادارتی اور عوامی پذیرائی مل رہی ہے کہ مستقبل میں صرف وہی زبان زندہ رہ سکے گی جو جدیدیت اور جدید علوم کی ترجمانی کر سکے۔

جیسا کہ ضیاء الرحمٰن نے 'ڈان' میں لکھا ہے کہ:

"Urdu is read، spoken and understood throughout the country.

---

(۱) F.E.K.Key بحوالہ: ماہنامہ ساحل جنوری، فروری ۲۰۰۵ء۔

English is Pakistan's lingua franca. Here I would like to clarify the meaning of lingua franca. It means 'a language that is adopted as a common language between speakers whose native languages are different.' In Pakistan، all official work is done in English. Teachers and college professors lecture in English (research work is done at university level as well in English.). Lawyers and court proceedings are conducted in English. The common people communicate in a hybrid tongue، Urdu mixed with English terms...Unity and harmony comes with a common language. In the case of Pakistan، it is Urdu. But to progress and keep abreast with the developing world، adopt English as your first language. Let your mother tongue be your second language spoken at home، if you so please".[1]

مطلب یہ کہ اردو تو 'لنگوا فرنیکا' (Lingua Franca) ہے اور سارے پاکستان میں سمجھی اور بولی جاتی ہے لیکن ترقی اور جدیدیت کے لیے ہمیں انگریزی کو قومی زبان بنانا ہوگا اور مادری زبانوں کو دوسری حیثیت دینا ہوگی۔

اور اگر اردو کو لاطینی یا انگلش میں لکھنا شروع کر دیا جائے تو آہستہ آہستہ اردو رسم الخط ختم ہو جائے گا نتیجتاً اگلی نسلیں بولیں گی اردو اور لکھیں گی انگریزی۔ جب لوگ اردو رسم الخط کو پڑھ نہ سکیں گے تو اردو زبان کا علمی ورثہ، مفکرین، علماء، شعراء اور بزرگوں کی لاکھوں کتابیں نسلِ نو کے لیے محض کاغذ کا ٹکڑا بن کر رہ جائیں گی یا ایسا علمی ورثہ جس کی نہ کوئی علمی قدر باقی رہ جائے گی نہ عملی۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ غیر ملکی ادارے اور این دی اوز پاکستان میں تعلیمی میدان میں کیوں اربوں روپے خرچ کر رہے ہیں؟ اور اب سی پیک کی وجہ سے پاکستان میں چینی زبان (Mandarin) کا غلغلہ مچا ہوا ہے۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی اور!

بقول اکبر الہ آبادی:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ

(1) https://www.dawn.com/news/1094034

زبان، اصطلاحات اور تہذیب

دنیا کی اکثر تہذیبوں کے تشکیلی عناصر تین رہے ہیں۔

۱۔ جغرافیائی عنصر ۲۔ حیاتیاتی عنصر ۳۔ نظریاتی عنصر

حیاتیاتی عنصر میں رنگ، نسل، وراثتی و نسلی صلاحیت، عادات اور زبان شامل ہیں۔ کسی بھی تہذیب کی ادبیات یا لٹریچر، دریافت و ایجادات زبان ہی کی وجہ سے محفوظ رہتی ہیں جو زبانیں آج فنا ہو چکی ہیں ان کی تہذیبوں کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان اور اس کی اصطلاحات اپنے ایک خاص تہذیبی پس منظر سے وابستہ ہوا کرتی ہیں۔ یعنی اس کا خاص علمیاتی، مذہبی، تاریخی، سماجی اور معاشی پس منظر ہوتا ہے جس سے اسے جدا کر کے دیکھنے اور کسی دوسری تہذیب و ثقافت و معاشرہ پر منطبق کرنے سے بڑے مغالطے اور گمراہیاں جنم لیتی ہیں۔ ایسا معاشرہ اپنا منفرد تشخص و پہچان کھو بیٹھتا ہے۔ مثلاً 'معصوم' کا تصور اہل سنت کے ہاں صرف حضرت محمد ﷺ کے لیے خاص ہے جبکہ شیعیت میں امامت سے وابستہ ہے۔ Dead Labor مارکس ازم کی اصطلاح ہے جس کا ترجمہ 'مردہ مزدور' غلط ہے۔ عربی یا اسلامی اصطلاحات و تراکیب مثلاً: عدت، طلاق، اذان، اجماع، جمہور، عصمتِ انبیاء، عدالتِ صحابہ وغیرہ کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔

مغرب کے تہذیبی ڈھانچہ سے برآمد شدہ اصطلاحات Liberty، Equality، Tolerance وغیرہ کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کا اطلاق غیر مغربی سماج و تہذیب پر درست و قابلِ عمل ہے۔ 'شورائیت' کو جمہوریت قرار دینا، پوری اسلامی تاریخ کو 'ملوکیت' کہنا، 'مجلسِ شوریٰ' کو پارلیمنٹ سمجھنا، 'حقوق العباد' کو انسانی حقوق باور کرنا، 'دولت مندی' کو سرمایہ داری سمجھنا، 'حفظِ مراتب و درجات' کو مساوات قرار دینا، Tolerance کو 'رواداری' کہنا۔ یہ کسی تہذیب کے کُل کو جُز کے طور پر دیکھنا اور 'تہذیبی خودکشی' کے مترادف ہے۔ اسلام میں 'ہیومن رائٹس' کی بجائے رشتوں کے حقوق ہیں۔ 'لبرٹی و فریڈم' کے بجائے عبدیت و عبادت ہے۔ 'Equality' کی بجائے 'حفظِ مراتب' کا نظام ہے۔ مرد و زن برابر نہیں بلکہ ان کا دائرہ عمل و ذمہ داریاں ان کی فطری و روایتی صلاحیتوں کے مطابق منقسم ہیں۔ یہاں 'مذہبی مساوات' نہیں مذہبی تقسیم کا تصور، بنیادیں استوار کرتا ہے۔ 'باہمی رضامندی' کے نام پر بھی سود، زنا اور ہم جنس پرستی کی اجازت نہیں۔ اسلام میں ترقی کا مغربی تصور موجود نہیں یعنی یہاں صرف دنیا میں 'ترقی' یعنی صرف ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً﴾ مطلوب نہیں بلکہ ﴿وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ یعنی آخرت میں کامیابی اور ﴿وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ بھی لازمی جزو ہے گویا جو آگ سے بچا لیا گیا وہی کامیاب ہوا کا تصور اصل مقصود ہے۔[1] اسلام میں 'حق' اضافی (Relative) نہیں جو ہر کسی کا جدا ہو

(۱) البقرہ: ۲۰۰، ۲۰۱، الکہف: ۱۰۴

اور سب اپنی اپنی جگہ درست بھی ہوں بلکہ 'الحق' ایک اور اٹل ہے۔[۱] لہٰذا الوہی ہدایات کے قلب و قالب میں مغربی اصطلاحات کا پیوند لگانا سنگین نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مغرب سے آنے والی ہر شے اس کی اپنی اقدار وروایات کی جڑوں سے پیوستہ ہوتی ہے۔ لہٰذا غالب تہذیب کے فکر و فلسفہ سے واقفیت کے بغیر بظاہر اس کی مثبت چیزوں کو بھی اختیار کر لینا در حقیقت اس تہذیب میں ضم ہونا بلکہ تحلیل ہو جانا ہے۔ مغرب سے مرعوبیت کو ایرانی اسکالرز سید احمد فردید اور جلال احمد 'غرب زدگی' کا نام دیتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ مسیحی مابعد الطبیعیات میں پولسی بدعات و اضافات[۲] اس قدر سرایت کر چکے ہیں کہ سماوی مذہب کی باقیات محض آٹے میں نمک کے برابر رہ گئی ہیں۔ اور جہاں تک مغربی تہذیب کا معاملہ ہے تو یہ تاریخ عالم کی وہ واحد تہذیب ہے جس کا فکر و فلسفہ وعلمیات اور دیگر علوم طبیعیہ و سماجیہ، خدا، آخرت اور رسالت گویا مذہبی اقدار کے دانستہ و نادانستہ انکار پر استوار ہے۔ آزادی اور سرمایہ کی بنیاد پر خواہشات کی تکمیل و ترقی اس کی بنیادی اقدار ہیں۔

قرآنی زبان اور الوہی تحفظ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾[۳] اور یہ کہ ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾[۴] "اس کتاب پر باطل حملہ آور نہیں ہو سکتا نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے۔ یہ کتاب اتاری گئی ہے حکیم وحمید کی طرف سے۔" مسلمانوں کو اپنے رب کا شکر بھی کرنا چاہیے اور انہیں اس بات پر فخر بھی ہونا چاہیے کہ قرآن کے متن اور مفہوم کی حفاظت کی ذمہ داری خود خالقِ قرآن نے لی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ[۵] قرآن کی معنوی حفاظت کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"دیکھیے قرآن خود اپنی حفاظت کس طرح کرتا ہے اور کیوں (مذکورہ) چیلنج دیتا ہے۔ اس آیت کے ضمن میں

---

(۱) الحج : ۶۲

(۲) مسیحی بدعات: اہلِ کتاب کے ہاں شروع میں لفظ "بدعت Heresy" سے مراد 'فرقہ' تھا اور اس کا بدعتی ہونا ضروری نہ تھا (اعمال ۵: ۱۷ اور اعمال ۲۴: ۵)۔ بعد ازاں اس کے معنی صحیح عقیدہ سے ہٹ جانے کے ہو گئے (۲ پطرس ۲: ۱) (قاموس الکتاب)۔ بدعت سے مراد وہ متفقہ و مسلمہ عقائد وروایات کے مخالف وہ امور ہیں جو کہ عموماً چرچ یا مذہبی تنظیم کے خلاف ہوں۔ بدعت یہودیت اور اسلام میں بھی مستعمل ہے لیکن عیسائیت میں یہ بہت وسیع علمی، سیاسی و سماجی اور وحشت ناک تاریخی پس منظر کی حامل اصطلاح ہے۔

(۳) الحجر : ۹

(۴) فصلت: ۴۲

(۵) اسرار احمد، ڈاکٹر، بیان القرآن، تفسیر المائدہ : ۳۰

غلام احمد پرویز صاحب، منکرِ حدیث (۱۹۰۳ء-۱۹۸۵ء) کہتے ہیں کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کا مطلب ہے کہ ایسا نظام وضع کیا جائے جس میں کسی کو چوری کی ضرورت نہ پڑے۔ ﴿فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ کے الفاظ سے جو مطلب پرویز صاحب نے نکالا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اور اگر فرض کرلیں کہ ایسا ہی ہے تو پھر ﴿جَزَاءً بِمَا كَسَبَا﴾ کی کیا تاویل ہو گی؟ یعنی جو کمائی انہوں نے کی ہے اس کا بدلہ یہ ہے کہ ایک اچھا نظام قائم کر دیا جائے؟ اس کے بعد پھر ﴿نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ﴾ کے الفاظ مزید آئے ہیں۔ "نکال" کہتے ہیں" عبرتناک سزا کو" تو کیا ایسے نظام کا قائم کرنا اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا ہو گی؟ آپ نے دیکھا قرآن کے معنی و مفہوم کی حفاظت کے لیے بھی الفاظ کے کیسے کیسے پہرے بٹھا دیے گئے ہیں؟

گزشتہ صحفِ سماویہ کے برخلاف یہ خوشخبری بھی دی گئی کہ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۞ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۞ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۞ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ [1]

"(اے نبی ﷺ) آپ (ﷺ) قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور (آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ ہم جب اسے پڑھ لیں تو آپ (ﷺ) اس کے پڑھنے کی پیروی کریں، پھر اس کا واضح کر دینا ہمارا ذمہ ہے۔"

قرآن کا جمع کرنا، پڑھوا دینا (قراءت)، قرآن کے اصل پیغام کی تبیین و تفہیم و تشریح بھی اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ مثلاً سورۃ النساء کی آیات ۱۲۷ اور ۱۷۶ میں " وَيَسْتَفْتُونَكَ " کے الفاظ کے ذریعے قرآن کہتا ہے کہ اللہ خود اس معاملے کی وضاحت کر دیتا ہے۔ نیز حضرت محمد ﷺ کی بھی یہ منصبی ذمہ داری رہی کہ وہ بھی کلام اللہ کی وضاحت فرمائیں:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ [2]

"(اے نبی ﷺ!) ہم نے یہ ذکر آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس کو واضح کر دیں کہ ان پر کیا کچھ نازل ہوا ہے۔"

نتیجہ عیاں ہے کہ قرآن اپنی اصل پر قائم ہے۔ گویا قرآن محفوظ تو اس کی زبان عربی بھی ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید اور اس سے منسلک افراد و اقوام بھی حاملِ دوام و قوام۔

---

(۱) القیامہ: ۱۶-۱۹

(۲) النحل: ۴۴

حفاظتِ قرآن کے ذرائع

۱۔ حفظِ قرآن ۲۔ تعلیم القرآن ۳۔ عمل بالقرآن ۴۔ کتابتِ قرآن

خدا اور بائبل

خدائے بزرگ و برتر نے کتابِ مقدس کی حفاظت کی ترغیب تو دی لیکن اس کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہیں اٹھائی، گویا کتابِ مقدس میں حذف و اضافہ کا راستہ کھلا تھا اور ہے۔[۱] نبی خاتم ﷺ کی لسانِ وحی سے اہلِ کتاب پر یہ فردِ جرم عائد کیا گیا کہ انہوں نے منزل من اللہ صحفِ سماویہ کی قدر نہ کی، ان کا انکار کیا، ان میں تحریفِ لفظی و معنوی کی اور عہد کی پاسداری نہ کی۔[۲] یاد رہے پہلی بائبل یونانی زبان (Koine Greek) جسے (Biblical Greek) یا (Hellenistic) بھی کہا جاتا ہے، میں تحریر کی گئی تھی اور یہ ایک مردہ زبان مانی جاتی ہے۔ بائبل کی الہامی زبانیں عبرانی (Hebrew) اور آرامی (Aramaic) بھی فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ موجودہ اسرائیل میں Eliezer ben Yahuda (۱۸۵۸ء-۱۹۲۲ء) اور اس کے خاندان نے عبرانی زبان کے احیاء میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

عربی کی قبولیت اور مؤثر ہونا

عربی زبان دنیا کی واحد زبان ہے جس کے دو اڑھائی سو الفاظ دنیا کے کسی بھی خطہ ارضی کا عام مسلمان بھی سمجھتا اور استعمال کرتا ہے۔ اس میں نسل، رنگ اور زبان کا امتیاز بھی موجود نہیں۔ مثلاً اذان، سلام مسنون، وضو، سورۃ الفاتحہ، تکبیر، الحمدللہ، استغفر اللہ، ماشاءاللہ، چند بنیادی سورتیں، ایمان و عقائد سے متعلق چند ضروری باتیں، دعائیں، نکاح، طلاق، میراث وغیرہ۔ زبانیں عموماً ۵۰۰ سال بعد تبدیل ہو جایا کرتی ہیں لیکن عربی کا رسم الخط، ذخیرۂ الفاظ اور قواعد و ضوابط وغیرہ آج بھی وہی ہیں جو کئی سو سال قبل تھے۔ گویا اگر محمدِ عربی ﷺ کے ہزاروں سال قدیم جدِ امجد میں سے کوئی تشریف لے آئے تو اسے بات سمجھنے سمجھانے میں مشکل پیش نہ آئے

---

(۱) مکاشفہ ۲۲: ۱۸-۱۹ میں درج ہے: ''میں ہر ایک آدمی کے آگے جو اس کتاب کی نبوت کی باتیں سنتا ہے گواہی دیتا ہوں کہ اگر کوئی آدمی ان میں کچھ بڑھائے shall add unto تو خدا اس کتاب میں لکھی ہوئی آفتیں اس پر نازل کرے گا۔ اور اگر کوئی اس نبوت کی باتوں میں سے کچھ نکال ڈالے shall take away from the words تو خدا اس کی زندگی کے درخت اور مقدس شہر میں سے جن کا اس کتاب میں ذکر ہے اس کا حصہ نکال ڈالے گا۔''

(۲) اور یہ جو یہودی ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ کلمات کو ان کے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔۔ لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر رکھی ہے۔۔ (النساء:۴۶)؛ نیز فرمایا گیا: '' اے اہلِ کتاب! حق و باطل کو کیوں خلط ملط کر رہے ہو اور کیوں حق کو چھپا رہے ہو؟ (آلِ عمران:۷۱)؛ نیز آلِ عمران:۷۸، ۱۸۷، البقرہ:۱۰۱ وغیرہ۔

گی۔بے شک کچھ الفاظ و اصطلاحات بھی عربی میں رائج ہوئیں لیکن قرآن کی عربی مبین پر وہ ہر گز اثر انداز نہ ہو سکیں۔

معروف انگریز مورخ فلپ کے حتی(۱۸۸۶ء-۱۹۷۸ء)اعتراف کرتا ہے کہ:

"قرآن پاک کی عربی اتنی ہمہ گیر اور مکمل ہے کہ مختلف عربی لب ولہجے کے باوجود عربی زبان کے ٹکڑے نہیں ہوئے حالانکہ خود رومی زبان بھی بعد میں کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔بے شک ایک عراقی ایک یمنی کا عربی لہجہ سمجھنے میں مشکل محسوس کرے گا لیکن وہ اس کی لکھی عربی کو بآسانی سمجھ لے گا۔"[1]

امریکی خلائی ماہر طبیعیات و مؤرخ مائیکل ایچ ہارٹ(۱۹۳۲ء)اعتراف کرتا ہے کہ:

"قرآن نے مسلم تہذیب میں مرکزیت پیدا کی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے عربی میں لکھا گیا۔شاید اسی وجہ سے عربی باہمی ناقابلِ فہم مباحث میں الجھ کر منتشر نہ ہوئی۔"[2]

کتاب مقدس کے کئی قدیم نسخے موجود ہیں مثلاً:نسخہ سینائی،نسخہ اسکندریہ،وطیقانی نسخہ،افرائیمی نسخہ،نسخۂ بیزائی۔لیکن ان کا متن قابل اعتماد مندرجہ ذیل اسباب کی بناء پر مشکوک ہے:

۱۔کوئی قدیم نسخہ چوتھی صدی سے زیادہ پرانا نہیں۔

۲۔کسی نسخہ میں مکمل عہد نامہ عتیق اور جدید موجود نہیں،یعنی کامل کتابِ مقدس کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔

۳۔کوئی قدیم نسخہ اصل الہامی زبان(عبرانی،آرامی)میں نہیں ہے۔

۴۔موجودہ 'کیتھولک بائبل' کے عہد نامہ عتیق میں ۴۶ اور عہد نامہ جدید میں ۲۷ کتابیں ہیں،اس طرح کل ۷۳ ہوئیں۔جبکہ اس کے برعکس 'پروٹسٹنٹ بائبل' کے عہد نامہ عتیق میں ۳۹ اور عہد نامہ جدید میں ۲۷ کتابیں ہیں۔اس طرح کل ۶۶ کتب ہوئیں۔گویا کیتھولک بائبل کی سات(۷)کتب پروٹسٹنٹ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہیں جنہیں "اپاکرفہ"(Apocrypha)یا غیر الہامی تصور کیا جاتا ہے۔

مستند مسیحی ماہرِ الٰہیات ایلن ڈگلس بائبلی دستیاب نسخوں اور ان کے تراجم کے حوالہ سے کہتے ہیں:

"تراجم الہامی نہیں ہیں۔نقل کرنے والوں سے بھی غلطیاں ہوئیں۔مصنفوں کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخوں میں سے اب کوئی بھی دستیاب نہیں۔"[3]

---

(1) Hitti, Philp K., History of the Arbs, Macmillan Education LTD, London, 1970, (P:117)۔

(2) Hart, Micheal H, The 100 A Ranking of the most Influential Persons in History, Carol Publishing group, New York,1993/

(3) Allen, Douglas, Myth and Religion in Mircea Eliade, Routledge, New York,2002.

عربی زبان اور اس کی خصوصیات

عربی سامی زبان ہے۔ حمورابی (۱۷۸۵-۹۲ق م) کا قانون جو شریعتِ موسوی سے بھی تین چار صدیوں قبل مرتب کیا گیا، دنیا کا قدیم ترین ضابطہ ہے۔ بقول 'العرب قبل الاسلام' کے مصنف جرجی زیدان کہ:

"یہ اولین قدیم و کامل علمی نسخہ عربی الفکر ہے۔"(۱)

زبانوں کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ اختلاط، مزاحمت اور انقلاب برداشت نہیں کر پاتیں اور فنا ہو جاتی ہیں یا اپنی اصلیت کھو بیٹھتی ہیں۔ عربی ان معنوں میں بھی ایک زندہ زبان ہے کہ اس نے ہر طرح کے حالات کا نہایت ثابت قدمی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس کے بالمقابل آریہ ورت، سنسکرت، سریانی، لاطینی، مجوسی یا فارسی کی ژندی زبانیں، فراعینِ مصر کی قبطی، ہومر کی یونانی مردہ ہو چکیں۔

رضی الدین سید کہتے ہیں:

" عراق، مصر اور روم بڑی جاندار تہذیبوں کے مراکز تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی تہذیب عربی زبان کو مسخر نہ کر سکی۔ (اس کے برعکس) ہم اپنی مقامی زبان سندھی کو دیکھتے ہیں کہ سندھ کی عرب فتوحات کے بعد اس کا رسم الخط تبدیل ہو کر عربی ہو گیا۔ گزشتہ سات سو سال میں انگریزی زبان اس قدر تبدیل ہو چکی ہے کہ چاسر کی شاعری (Chaucer's Poetry) اس کے آبائی شہر لندن کے انگریز بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔" (۲)

بائبل کی انگریزی کے مختلف طبعات کے حوالہ سے Got Question لکھتا ہے کہ انگریزی زبان پچھلے چار سو سال میں اتنی تبدیل ہوئی ہے جتنی یونانی زبان دو ہزار سال میں نہیں ہوئی۔

"Over time، the English language changes/develops، making updates to an English version necessary. If a modern reader were to pick up a 1611King James Version of the Bible، he would find it to be virtually unreadable. Everything from the spelling، to syntax، to grammar، to phraseology is very different. Linguistics state that the English language has changed more in past 400 years than the Greek language has changed in the past 2000 years.(3)"

---

(۱) جرجی، زیدان، العرب قبل الاسلام، مؤسسة دار الهلال، القاہرہ، مصر، ۲۰۰۵ء۔

(۲) 'عربی جسے وقت کی آندھیاں کبھی بوسیدہ نہ کر سکیں'، صحیفہ اہل حدیث، نومبر ۲۰۱۳ء۔

(3) https://www.gotquestions.org/Bible-versions.html

یہ بھی حقیقت ہے کہ کہنے کو تو مصر، لیبیا، الجزائر، موریطانیہ اور حجاز کی زبان عربی ہے اور ان کے لہجات میں اختلاف بھی ہے لیکن فصیح و معیاری عربی قرآن مجید ہی کی تسلیم کی جاتی ہے۔ فصیح زبان وہ ہے جو ماضی میں بڑے شعراء و فضلاء استعمال کرتے رہے، در حقیقت زبان کے صحیح ہونے کی سند قدماء سے ہی لی جاتی ہے۔ آج اگر صدیوں قبل کی شخصیت مثلاً حضرت عبد المطلب بھی تشریف لے آئیں تو انہیں ہم عصر فصیح عربی سے اجنبیت محسوس نہ ہو گی جس کے فنی اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عربی کی پہلی خصوصیت اس کا 'اعرابی' ہونا ہے۔ 'اعراب' سے مراد کلمات کے اواخر کا زیر، زبر، پیش اور مختلف عامل حروف لگنے سے تبدیل ہونا ہے۔ معرب ہونا قدیم تمدن کی زبانوں کی خصوصیت رہی ہے۔

۲۔ 'نزاکتِ تعبیر' یعنی ہر معنی کے لیے ایک خاص لفظ ہے۔ دن کی مختلف گھڑیوں کے لیے ۱۵ سے زائد الفاظ ہیں جبکہ قوتِ بصارت کے لیے زائد از دس الفاظ مستعمل ہیں۔ انسانی جذبات کی ترجمانی کے لیے عربی غالباً دنیا کی سب سے زیادہ مال دار زبان ہے۔

۳۔ 'اعجاز و ایجاز' یعنی مختصر الفاظ سے کثیر معنی پر دلالت کی جاتی ہے۔

۴۔ 'مترادفات و اضداد' یعنی ایک معنی کے لیے کئی الفاظ کی موجودگی جیسے شیر، اونٹنی، گھوڑے، تلوار اور شراب کے لیے دسیوں نہیں سینکڑوں نام ہیں۔

۵۔ 'الامثال' اس سے مراد وہ بلیغ و سبق آموز کلام ہے جو طویل انسانی تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ یاد رہے عہد نامہ عتیق میں امثال (Proverbs) کے نام سے بھی ایک کتاب ہے۔ اسرائیلی انبیاء جیسے حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بھی تماثیل یا ضرب الامثال با کثرت استعمال کیا کرتے تھے۔

۶۔ 'معانی کی بہترین صوتی ترجمانی' عربی زبان کی صوتیات انسانی جذبات کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔

انگریزی زبان کے مزاج کے بارے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم کہتے ہیں کہ:

> "اگر آپ اس میں ایک گھنٹہ بھی بات کریں تب بھی سمجھنے والا نہیں سمجھ سکے گا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ کی بات مثبت ہے یا منفی، تائید میں ہے یا تردید میں، دوستی میں ہے یا دشمنی میں، کچھ ظاہر نہ ہو گا۔ یہ حیلہ گری و شعبدہ بازی صرف انگریزی میں ہی ممکن ہے کسی اور زبان میں نہیں۔ گویا ڈپلومیسی انگریزی زبان کا اہم وصف ہے۔"

عربی کی کتابت اور حفظ

حافظے کی بنیاد سماعت پر ہوا کرتی ہے اور کتابت حافظے کی مدد کے لیے ہوتی ہے۔ گویا اصل اعتبار سماعت و حافظہ کا ہوتا ہے اور کتابت در حقیقت اس کی اعانت کے لیے ہوا کرتی ہے۔ یاد رہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام عشرہ

تحریری الواح کی شکل میں کوہِ طور پر عطا کی گئیں[۱] جو تابوتِ سکینہ میں رکھی گئی تھیں مگر کھو چکیں یا ضائع ہو گئیں۔ ۔جو بچی کچھی بائبل آگے روایت ہوئی وہ در حقیقت سینہ بہ سینہ پہنچی۔ گویا اصل مقامِ تحفظ سینہ انسانی ہی ہے۔

عرب اُمی تھے، وہ زبان دانی، شعر و ادب اور علم الانساب پر اس قدر دسترس رکھتے تھے کہ اپنے مقابلے میں بقیہ دنیا کو عجمی 'گونگا' کہا کرتے تھے۔ ان کا یہ امتیاز ان کے غیر معمولی حافظے ہی کی بدولت تھا۔ اسلامی تاریخ میں بعد از دورِ نبوی بھی غیر معمولی حافظے کی حیرت انگیز مستند مثالیں تواتر سے ملتی ہیں۔ مسلمانوں کے حافظے بہترین ہونے کا ایک اہم سبب 'حفظِ قرآن' کی فضیلت بھی ہے۔ اس امت کی ایک صفت یہ بھی روایت کی گئی کہ: 'اناجیلھم فی صدورھم' ۔اس کے برعکس اہلِ کتاب کی الہامی کتب کے ضائع ہو جانے کا ایک اہم سبب ان کے حفظ کا اہتمام نہ ہونا بھی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: (کان خُلُقُه القُرآنَ)[۲] "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن تھا۔" گویا آپ چلتا پھرتا قرآن تھے۔

قرآن اور قلبِ انسانی

اللہ علیم و خبیر نے قرآن مجید کا اولین مکان 'حفظ قلب انسانی' منتخب فرمایا، جس کے کئی اسباب ہیں مثلاً:

۱۔ قرآن حفظ کرنے سے فرد کا اللہ سے بلاواسطہ قلبی و روحانی تعلق استوار ہوا۔

۲۔ قرآن جس کا موضوع انسان اور اس کی ہدایت ہے، انسانی قلب میں اس کی موجودگی فرد کا رشتہ براہِ راست قرآن سے مضبوط کرتا ہے۔

۳۔ قرآن کی قلبِ سلیم میں موجودگی نے اس کا دیگر مسلمانوں سے رابطہ موثر بنایا۔

۴۔ قرآن کی قلب میں موجودگی سے مسلمان کا اعتماد بڑھا اور وہ پیغام الٰہی کو جامعیت و تسلسل کے ساتھ غیر مسلموں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

مقامی زبانیں اور قرآنی قراءات

ہر بڑی زبان کے کئی تلفظ (Pronunciations)، لہجے، مقامی زبانیں (accents/dialects) رسم الخط (Scripts) اور حروفِ تہجی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً انگریزی کے مشہور لہجے امریکن، برطانوی (انگلینڈ و اسکاٹ لینڈ) اور آسٹریلین ہیں اور اردو کے دکنی، دہلوی اور لکھنوی، جبکہ پنجابی کے جھنگوی و پوٹھوہاری وغیرہ ہیں۔ یہ تلفظ، لہجے اور مقامی زبانیں اس زبان کی کسی کمزوری یا نقص کی بجائے اس کے تنوع اور وسعت کو ظاہر کرتے ہیں اور اس کی قدر

---

(۱) الاعراف: ۱۴۵۔۱۵۰؛ خروج ۲۹: ۳۴؛ استثناء ۱۳: ۴۔ تحریری الواح Tablets of Testimony/Covenant

(۲) البانی، ناصر الدین، صحیح الأدب المفرد (رقم: ۲۳۴)۔

بڑھاتے ہیں مثلاً:

اردو میں: (۱) لُو چل رہی ہے یہ کتاب لو چراغ کی لَو

۲۔ دہی کھٹی ہوتی ہے (لکھنوء) دہی کھٹا ہوتا ہے (دہلی)

انگریزی میں: (۱) Write Rite Right (۲) Often (آفٹن، آفن)

رومن اردو میں: Zaheer یا Zahir زاہر، ظہیر، ظاہر۔ یہ یکساں تلفظ مگر مختلف الخط اور مختلف المعنی الفاظ ہیں۔

عربی میں: (۱) مالک۔ ملک (الفاتحہ) (۲) ارجلکم۔ ارجلِکم (المائدہ) (۳) صراط۔ سراط (الفاتحہ) (۴) تحتھا الانھٰرُ۔ تحتھا الانہار (التوبہ)

قراءاتِ قرآنیہ اور مستشرقین

پاکستان بائبل کارسپانڈنس انسٹی ٹیوٹ، امریکی مشنری وسابق قادیانی ڈاکٹر نبیل قریشی (م:۲۰۱۷ء) اور پروفیسر فوزی عرزونی، قرآنی آیات اور بائبل سے ان کا من مانا تقابل کر کے بے بنیاد اور گمراہ کن افکار واقوال پھیلا کر مسلمانوں میں شکوک پیدا کرنے اور عیسائیوں کو دینِ حق قبول کرنے سے روکنے میں مصروف ہیں۔[1] مستشرق آرتھر جیفری (۱۸۹۲ء-۱۹۵۹ء) نے ضعیف ومنقطع قراءات قرآنیہ کو بھی مصاحف قرار دیا۔

اسے دو مغالطے ہوئے: پہلا قراءات کو مصحف قرار دینے کا اور دوسرا ضعیف ومنقطع قراءات کو مصحف سمجھنے کا۔ ڈاکٹر مہر علی اور ڈاکٹر محمد خلیفہ نے آرتھر جیفری کے قرآن مجید پر اعتراضات کے مفصل ومسکت جوابات دیے ہیں۔[2] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے متعلق مضطرب المتن ضعیف وناقابلِ اعتبار روایات سے غلط فہمیاں پیدا کرنا مستشرقین کا پرانا وطیرہ رہا ہے۔ مثلاً یہودی گولڈ زیہر (۱۸۵۰ء-۱۹۲۱ء) اور دیگر مستشرقین کا وہم ہے کہ رسم پہلے سے ثابت شدہ تھی اور اس میں بہت سی قراءات کا احتمال تھا۔ مسلمان قراء نے اپنی خواہش واستطاعت کے مطابق اس رسم سے قراءات نکال لیں۔ مستشرقین ودیگر مرعوبین کا گمان ہے کہ قرآن جو جبریلِ امین آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر نازل ہوئے اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک ہی حرکت اور ایک ہی لفظ کی صورت میں نازل ہوتا جبکہ امت مسلمہ کے نزدیک قراءات اصل ہیں۔ پھر ان قراءات کی ادائیگی کے

---

(۱) صحائف کا پیغام (رسالۃ من الکتاب المقدس) (DVD) اور ویب ایڈریس unchangingworld.com

(2) Khalifa, Muhammad Dr. The Sublime Quran & Orientalism , international Islamic Publishers (Pvt.) Ltd. Karachi.

Ali, Mohar Dr. The Quran & Orientalists, Jamiyat Ihyaa Minhaaj Al- Sunnah, Essex, UK, 2004.

لیے رسمِ عثمانی بنایا گیا تا کہ تمام قراءات اس رسم میں سما جائیں اور کوئی بھی قراءات باقی نہ رہے۔ گویا مسلم امہ کا پختہ یقین ہے کہ قراءات اصل ہیں اور رسمِ عثمانی اس کے تابع ہے اور وہ ان قراءات کے لیے بنایا گیا ہے۔ تمام قراءات حق ہیں اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں اور یہ کہ تمام قراءات لغتِ عرب اور قبائلی لہجات کے مطابق ہیں۔

مصحفِ عثمانی

صحفِ عثمانی کی جمع و تدوین کا مقصد یہ نہ تھا کہ لوگوں کو قرآن کی ایک نص پر بحکم ریاست مجبور کیا جائے بلکہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ متواتر قراءات کو اکٹھا کر دیا جائے۔ اور یہ کہ ایک سے زائد قراءات کی اجازتِ ایزدی جو ابتدءً امت کی آسانی یعنی یسر و سہولت کی خاطر مرحمت فرمائی گئی تھی اب مصالح امت ہی کی خاطر صلحائے امت کی جانب سے اس کے سد باب کے لیے اقدامات کیے گئے۔ اور یہ کہ مصاحف عثمانیہ کو حرکات اور نقاط سے خالی اس لیے رکھا گیا کیونکہ اس طرح اس میں تمام مستند قراءات کا امکان و احتمال باقی رہا اور لوگوں کو منسوخ اور شاذ کی بجائے متواتر قراءات پر جمع بھی کرتا تھا۔[1] آثار بتاتے ہیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ و سیدنا سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اس بات کو سمجھ چکے تھے کہ ابتداء میں (بحکم ربی) سات حروف کی قراءات حرج اور مشقت سے بچنے کے لیے تھی۔ نیز اللہ کے پیغام کو مخاطبینِ اول یعنی عربوں کے علاقائی لب و لہجے اور تلفظ کے ساتھ پہنچانا متنوع قراءات کا مقصد تھا۔ اب یہ ضرورت ختم ہو چکی ہے اور لوگوں کو ایک متواتر قراءت پر جمع کر کے اختلافات کا سدِباب کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، رفقاءِ خاص کے اس اقدام پر متفق تھے تو گویا یہ ایک طرح کا اجماع تھا۔ اسلامی مرکزِ ریاست، مدینہ سے دور، قراءات کے اختلافات جنم لینا فطری تھا اور بحیثیت سربراہِ مسلم حکومت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس صورتحال کے تدارک کی کوشش کرتے اور انہوں نے اس کے لیے اجماعی و موثر اقدامات کیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو چھ قرآنی نسخے (مصاحف امام، مدنی، مکی، شامی، کوفی، بصری)، عالمِ اسلام میں بھیجے ان کے ساتھ قراء حضرات بھی قرآن پڑھنا سکھانے گئے۔

مشہور قراءات اور رسم الخط

(۱) امام عاصم (۱۲۸ھ / ۸۱۲ء) سے امام حفص کوفی (۱۸۰ھ / ۷۹۶ء): پاک و ہند، افغانستان، عرب دنیا، ترکی اور وسطی ایشیاء میں ان کی قراءت رائج ہے۔

---

(۱) حجیتِ قراءات (وفاق المدارس السلفیہ میں حجیت قراءات کا نصابِ تعلیم۔ کچھ تنقیح و اضافہ کیا گیا ہے: مقالہ نگار)

(۲) امام نافع مدنی (۱۶۹ھ/ ۷۶۹ء) سے امام عثمان بن سعید ورش مصری (۱۹۷ھ/ ۸۱۲ء)۔ شمالی افریقہ میں زیادہ رائج ہے۔

لگ بھگ ۱۶۰ھ سے چوتھی صدی ہجری تک قرآن 'خطِ کوفی' میں لکھا جاتا رہا اس کے بعد سے اسی کی ترقی یافتہ شکل 'خطِ نسخ' میں قرآن پاک لکھا جارہا ہے جبکہ الجزائر و مراکش میں 'خطِ مغربی' رائج ہے۔

ایڈورڈ ہنری پامر صحیفہ عثمانی کے مصدقہ و مسلمہ ہونے کی گواہی دیتے ہوئے کہتا ہے:

" (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کا متن (قرآن) تسلیم شدہ مصحف ہے اور ۶۶۰ء سے آج تک تمام مکاتبِ فکر کے نزدیک طے شدہ مسلمہ صحیفہ رہا ہے۔"[1]

قرآن اور بائبل پر جرمن تحقیق

جرمن عیسائی پادریوں نے بائبل کے یونانی زبان میں دنیا میں جتنے نسخے تھے کامل یا جزئی، ان سب کو جمع کیا۔ ان کے الفاظ کا باہم تقابل کیا گیا تو رپورٹ میں کہا گیا کہ:

" ان میں دو لاکھ اختلافی روایات ملتی ہیں اور قریباً ۲۵۰۰ بنیادی نوعیت کے اختلافات ہیں۔"

اسی طرح میونخ یونیورسٹی، جرمنی میں قرآنی تحقیقاتی ادارہ قائم کر کے قرآن کے قدیم ترین نسخے خرید کر، فوٹو لے کر تین نسلوں تک جمع کیے جاتے رہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کہتے ہیں کہ:

" جب میں ۱۹۳۳ء میں پیرس یونیورسٹی میں تھا تو اس تحقیقی ادارے کا ڈائریکٹر پریتسل (Pretzl) پیرس آیا تا کہ پیرس کی پبلک لائبریری سے قرآن کے قدیم نسخے حاصل کرے۔ اس پروفیسر نے مجھ سے بذاتِ خود بیان کیا کہ ہمارے انسٹیٹیوٹ میں قرآن کے ۴۲،۰۰۰ نسخے موجود ہیں اور ان میں تقابل کا کام جاری ہے۔ دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۵ء) میں اس ریسرچ بلڈنگ پر امریکی بم گرا تو عمارت مع عملہ و کتب خانہ تباہ ہو گیا۔ اس ادارے کی رپورٹ ایک رسالے میں شائع ہوئی جو بقول ڈاکٹر محمود غازی رحمۃ اللہ علیہ، انہیں ڈاکٹر حمید اللہ نے پڑھنے کو دی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ: " قرآن کے نسخوں میں سوائے کتابت کی غلطیوں کے کوئی اختلاف نہ ملا، یعنی قرآن تحریر کرنے یا شائع کرنے والوں سے کہیں 'ا' رہ گیا، کہیں 'ب' وغیرہ۔"

اللہ کا کلام 'قرآن' اور مصنفین کا معنوی الہام 'بائبل'

قرآن کلام اللہ ہے اور اس کا ایک ایک حروف و مفہوم اللہ علیم و حکیم نے بذریعہ جبریلِ امین اپنے رسول محمدِ

(۱) ریاض محمود، قرآن غیروں اور بائبل اپنوں کی نظر میں، مکتبہ سعد بن ابی وقاص، کراچی، ۲۰۱۲ء۔

عربی ﷺ پر نجماً نجماً نازل فرمایا اور یہ تا قیامت محفوظ و مامون ہے جسے 'وحی متلو' بھی کہتے ہیں۔ حدیثِ رسول بھی وحی کی ایک صورت ہے جسے 'وحی غیر متلو' کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ: "وہ (محمد ﷺ) اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔"(۱)

اس کے بالمقابل بائبل کے بارے میں ایلن ڈگلس لکھتے ہیں:

"اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ الہام کی نوعیت کیا تھی لیکن یہ ایمان رکھتے ہیں کہ ہر مصنف کو آزادی تھی کہ وہ اپنی شخصیت، تعلیم، تجربہ وغیرہ کو خاص حد تک استعمال کر سکے۔"(۲)

"Biblical Inspiration is the doctrine in Christian theology that the authors of the Bible were led or influenced by God with the result that writing may be designated in some sense the word of God.[3]"

حاصلِ بحث

- زبان ایک عطائی یا وہبی صلاحیت ہے۔
- انسانی قوتِ گویائی عالمِ خلق میں اپنی اعلیٰ ترین سطح پر ہے جو انسان کو دیگر مخلوقات پر امتیاز بخشتی ہے۔
- استعماریت چاہے مغربی ہو یا غیر مغربی ان کا علاقائی زبانوں سے تعلق منفی اور استحصالی رہا ہے۔ استثنیٰ صرف اسلامی دورِ حکومت کا ہے جس کا مقامی زبانوں سے تعلق مثبت و حوصلہ افزائی کا رہا۔
- زبان اور تہذیب کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زبان اگر فنا کے گھاٹ اتر جائے تو وہ تہذیب اپنے انفرادی و امتیازی تشخص کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔
- زبانیں فطری طور پر ہی جنم لیتیں اور پروان چڑھا کرتی ہیں، انہیں نہ مصنوعی طور پر پیدا ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ لاگو۔
- زبان کا ہر لفظ اپنے اندر پورا علمیاتی و تاریخی جہان سموئے ہوتا ہے جس کا اطلاق مخصوص سماج پر ہی ممکن ہے۔ ایک تہذیب کے الفاظ کو کسی دوسری تہذیب پر چسپاں کر دینا گمراہ کن ہے۔
- قرآن کی اندرونی اور بیرونی شہادتیں اور تاریخ یہ باور کراتی ہے کہ اس کتابِ مبین کا معاملہ دیگر صحفِ سماویہ سے کئی اعتبارات سے ممتاز و علو شان کا حامل ہے۔

---

(۱) النجم: ۳،۴۔
(۲) مضامینِ بے مثال (ص: ۲۲۳)

(3) Wikipedia. Vistd: 16th Sept-2017

- ⊙ عربی زبان کا تعلق چونکہ قرآنِ حکیم سے ہے اس وجہ سے اس میں کئی ایسے منفرد اعزازی پہلو متحقق کیے جاتے ہیں جن سے دیگر زبانیں محروم ہیں۔
- ⊙ قرآن اور دیگر سماوی کتابوں کا ہمہ پہلو غیر جانبدارانہ تحقیقی جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ قرآن ہی وہ واحد الہامی کتاب ہے جو کلام اللہ ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔